مولانا جلال الدین رومی- شاعر اعظم انسانیت

ا۔ ج۔ آربری

قاہرہ میں، ۱۹۳۳ء کے موسم خزاں کی ایک صاف رات میں ستارے چمک رہے تھے اور ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ شہر کے ایک پرانے محلے میں مولویہ فرقے کے درویشوں کا سماع دیکھنے میں آیا۔ سفید بالوں والے لمبے چوڑے خرقوں میں ملبوس ایک احاطے میں جمع ہوئے تھے اور ایک خاص وقار اور متانت کے ساتھ سماع میں مشغول تھے اور اسی کے ساتھ کتنے ایسے ستاروں کی طرح تھے جو خورشید کے گرد گردش کر رہے تھے اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں مصروف تھے۔ ان کا سماع صوفیانہ بے خبری کے عالم میں جاری تھا گویا دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر، ہاتھ ہلا ہلا کر اور پیر پٹک پٹک کر۔ کتنی حیرت انگیز یاد ہے۔

مجھے بتایا گیا کہ یہ سماع بہت پرانا ہے یعنی اسلامی سرزمینوں پر مغلوں کے خوفناک حملوں کے زمانے میں اس نے رواج پایا اور یہ گم شدہ محبوب کے حصول کی کوشش کی ایک علامت ہے۔

میں سلسلۂ مولویہ کے بانی، جلال الدین رومی کے اشعار سے اس وقت آشنا ہوا، جب میں کیمبرج میں پڑھتا تھا۔ ہمارے استاد، معروف مستشرق رنالڈ نیکلسن تھے۔ وہ اس وقت اپنی آخری اور سب سے اہم تالیف یعنی عظیم عرفانی کتاب مثنوی معنوی کے ترجمہ و تحقیق میں مشغول تھے اور میرے لئے یہ دلچسپ تھا کہ ایک ایسی مجلس کا مشاہدہ کروں جس کو استاد نیکلسن نے نہیں دیکھا تھا یہ مجلسیں مولانا کی جدت فکر کی نتیجہ تھیں۔

محمد بن حسین بلخی معروف بہ جلال الدین رومی یا مولانا ۶ ربیع الاول ۶۰۴ھ کو شہر بلخ میں پیدا ہوئے۔ اس قدیم مرکز میں جو آج شمالی افغانستان میں ایک قصبے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس کی ایک طویل اور پر آشوب تاریخ ہے جس کا سلسلہ مولانا کی ولادت سے چند صدی پہلے سے ملتا ہے۔ بلخ، ہخامنشیوں کے زمانے میں، باکتریا جیسے بڑے صوبے کا مرکز تھا۔ بعد کی صدیوں میں بلخ کی اہمیت صرف تجارتی اور سیاسی نقطۂ نظر سے ہی نہ تھی بلکہ یہ ایک مشہور دینی مرکز بھی تھا۔ زرتشتیوں نے وہاں

کم سے کم پانچ بڑے بڑے آتشکدے قائم کئے۔ بودھ کے ماننے والوں نے ''نوبہار'' کے نام سے وہاں ایک بت کدہ تعمیر کیا جو ۲۳ ہجری ۶۵۳ عیسوی میں احنف بن قیس کے حملۂ بلخ تک موجود تھا اور اس میں شک نہیں ایسے زاہدوں اور ولیوں کی زادگاہ رہا ہے جنھوں نے تصوف کی تاریخ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ابراہیم بن ادہم، حکومت ترک کرنے اور درویشی اختیار کرنے سے قبل تک بلخ کے حاکم تھے۔ جلال الدین رومی کے والد، بہاء الدین ولد ملقب بہ سلطان العلماء کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق سے ملتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ ماں کی طرف سے طاقتور خاندان خوارزم شاہی کے قرابت دار تھے اور یہ وہی خاندان ہے جس کے ایک بادشاہ، سلطان محمد خوارزم شاہ نے شہر بلخ کو فتح کیا اور مولانا جلال الدین رومی کی ولادت سے ایک سال قبل بہاء الدین غوری سے اسے چھین لیا۔

بہاء الدین ولد علوم اسلامیہ کے ایک معروف عالم تھے اسی کے ساتھ تصوف میں بھی انھیں کمال حاصل تھا۔ حقیقت امر یہ ہے کہ یہ موضوع اب تک کسی حد تک پوشیدہ رہ گیا تھا اگر ایرانی استاد علامہ بدیع الزماں فروزانفر کتاب ''معارف'' شائع نہ کرتے۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد جو بہاء الدین ولد کے حکمت آمیز اقوال و افکار کا ایک مجموعہ ہے، یہ حقیقت بہت واضح ہوگئی۔ کتاب ''معارف'' ہمیں یہ موقع فراہم کرتی ہے کہ جلال الدین رومی کے بعض صوفیانہ افکار کی تعبیر وتفسیر اور ان کے عرفانی اصطلاحات کے معانی، ان کے والد کی تعلیم کی رو سے کریں۔

مشرقی ایران کے باشندے اپنے وطن پر چنگیز خاں کے خونخوار سپاہیوں کے حملے برداشت کرنے پر مجبور ہوئے اور مغلوں کی جنگوں اور حملوں نے بے شمار لوگوں کو آوارہ وطنی پر مجبور کردیا۔ چنگیز کے سپاہیوں نے بلخ کے عوام کا قتل عام کیا (۶۱۷ھ/ ۱۲۲۰ء) انہوں نے کسی کو زندہ نہیں چھوڑا اور جو کچھ انہوں نے دوسرے شہروں میں تباہی مچائی تھی، وہی کچھ بلخ میں بھی کیا۔ مغلوں نے بھیانک ترین قتل عام ۶۵۶ھ/ ۱۲۵۸ء میں بغداد میں کیا تھا۔ اور خوش قسمتی سے بہاء الدین اور ان کا خاندان مغلوں کے بلخ پہنچنے سے قبل ہی وہاں سے فرار کرگیا تھا۔

یہ آوارہ وطن چھوٹا سا کنبہ، پہلے نیشاپور میں قیام پذیر ہوا۔ اور ایران کے عظیم صوفی شاعر فرید الدین عطار نے جو کچھ ہی دنوں بعد مغلوں کے حملے میں شہید کردیئے گئے۔ اس خاندان کو خوش آمدید کہا تھا۔ اور بیان کیا گیا ہے کہ عطار نے خورد سال جلال الدین میں ولایت کی نشانیوں کا مشاہدہ کرلیا

تھا اور اپنی بہترین و معروف کتاب ''اسرار نامہ'' کا ایک نسخہ انھیں عنایت کیا تھا۔ مولانا کے آثار میں عطار سے اثر قبول کئے جانے کا مشاہدہ ہونے کے ساتھ صوفی شاعر اور مثنوی ''حدیقۃ الحقیقۃ'' کے مصنف سنائی سے بھی تاثیر پذیری کا اندازہ ہوتا ہے۔ گمان غالب ہے کہ مولانا جلال الدین رومی نے اپنے والد بہاء الدین ولد کے ایک مرید برہان الدین محقق ترمذی کے توسط سے جو سنائی کے آثار کے شیفتہ تھے، سنائی کے کلام و آثار سے واقفیت حاصل کی ہو۔

تارکین وطن یعنی بہاء ولد اور ان کا خاندان نیشاپور سے بغداد روانہ ہوگیا لیکن عباسیوں کے دار الحکومت میں کچھ دن قیام کرنے کے بعد شام اور ایشیائے صغیر کے لئے نکل پڑے اور سرانجام قونیہ میں سکونت اختیار کرلی۔ بہاء الدین کو شہر کے سلجوقی حکمراں کیقباد کی حمایت حاصل ہوگئی۔

طویل عمر بسر کرنے کے بعد بہاء الدین ولد نے ۶۲۷ھ / ۱۲۲۶ء میں وفات پائی۔ واضح رہے کہ اس مدت کے دوران مولانا روم کی شادی بھی ہوگئی اور وہ نئے ماحول سے پوری طرح آشنا اور علماء و فضلاء کے درمیان غیر معمولی شہرت کے مالک بھی ہوگئے۔ دوسرے سال برہان الدین محقق، قونیہ آئے اور جلال الدین کو سلسلہ تصوف میں شامل ہونے کی ترغیب دلائی ساتھ ہی سلسلہ تعلیم کی تکمیل کے لئے حلب اور دمشق کے سفر کے لئے تشویق بھی کی۔ ہمارے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں ہے کہ ہم دمشق میں جلال الدین کی اندلس کے عظیم صوفی محی الدین ابن عربی سے ملاقات اور شرف تلمذ کی بات کو قبول نہ کریں۔ محی الدین ابن عربی کی روح ۶۳۸ھ / ۱۲۴۰ء میں شام کے دار الحکومت میں ان کے جسد خاکی سے پرواز کرگئی اور مجھے چند سال قبل ان کی آرام گاہ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔

جب مولانا ۶۳۸ھ / ۱۲۴۰ء میں قونیہ واپس آئے تو غیاث الدین کیخسرو نے انھیں ان کے والد کے کام یعنی وعظ و نصیحت اور تعلیم و تعلم پر مامور کردیا۔ اس عہد کے ان کے بعض مواعظ موجود ہیں گویا انہوں نے خود علمی اور صوفیانہ زندگی اختیار کرلی تھی کہ شمس الدین تبریزی، وہ شخص جس نے بقول خود مولانا ان کی زندگی کو دگرگوں کردیا۔ ۶۴۲ھ / ۱۲۴۴ میں قونیہ پہنچے۔

شمس الدین تبریزی ایک قلندر تھے جو ادھر ادھر مارے پھرتے تھے۔ رومی کو ناگہاں اس آدمی میں ایک انسان کامل نظر آیا جس کی انھیں تلاش تھی۔ وہ بے پناہ جذبے کے ساتھ ان کے ساتھ ہوگئے اور سارا کام دھام چھوڑ دیا۔ اس ناگہاں تبدیلی نے بادی النظر میں ان کے دوستوں اور شاگردوں کو حیرت زدہ کردیا۔ پھر وہ ناراض اور غضبناک ہوکر اس فکر میں لگ گئے کہ کسی طرح اس آدمی کو یہاں

سے نکال باہر کیا جائے۔ جب شمس نے خود کو خطرے میں محسوس کیا تو قونیہ سے دمشق بھاگ گئے۔ رومی نے اپنے بیٹے سلطان ولد کو واپس لانے کے لئے بھیجا۔ لیکن اتفاق رائے کے بعد ایک بار پھر جلال الدین کے مریدوں کے اندر کینہ و حسد نے سر ابھارا اور شمس کو مجبوراً قونیہ سے فرار اختیار کرنا پڑا۔ اس بار کسی کو ان کی سرنوشت کے بارے میں کچھ بھی پتہ نہ چل سکا۔

سلطان ولد نے اپنے والد کے حالات میں لکھا ہے کہ مولانا اس جدائی کے سبب:

روز و شب در سماع رقصان شد　　بر زمین، ہمچو چرخ گردان شد
بانگ و افغان او بہ عرش رسید　　نالہ اش را بزرگ و خرد شنید
سیم و زر را بہ مطربان می داد　　ہر چہ بودش ز خان و مان می داد
یک زمان بی سمع و رقص نبود　　روز و شب لحظہ ای نمی آسود

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سلسلۂ مولویہ کے درویشوں کا رقص جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ محبوب کی تلاش وحصول کے لئے ایک یاس آمیز کوشش وجستجو ہے۔ یقیناً پہلی بار جب شمس الدین نے قونیہ میں قدم رکھا تھا تو مولانا اس وقت شاعری شروع کر چکے تے لیکن اس سلسلے میں وہ خود مختلف باتیں کہتے ہیں جو ان کے مقالات میں ملتی ہیں اور جو مولانا کی وفات کے بعد ''فیہ ما فیہ'' میں شامل ہیں، وہ کہتے ہیں کہ فن شاعری خراسان میں بہت زیادہ مقبول نہیں تھی اور اگر وہ خراسان میں رہ گئے ہوتے تو مستحکم و استوار نثر کے سوا کوئی اور تالیف اپنی یادگار نہیں چھوڑ پاتے۔ مزید کہتے ہیں کہ ''آخر میں یہاں تک دل رکھتا ہوں کہ یہ احباب جو میرے پاس آتے ہیں، اس خوف سے کہ کہیں رنجیدہ نہ ہو جائیں، شعر کہتا ہوں تا کہ وہ اس میں مشغول ہو جائیں۔ ورنہ میں کہاں اور شاعری کہاں؟ بخدا میں شاعری سے بیزار ہوں اور میرے نزدیک اس سے بدتر کوئی چیز نہیں ہے۔ اسی طرح کہ کوئی اپنا ہاتھ معدے میں ڈال کر مہمان کی اشتہاء کے لئے، دھو ڈالے کیونکہ مہمان کی اشتہاء کا تعلق معدے سے ہے''۔

اس میں شک نہیں کہ یہ حیرت میں ڈالنے والے الفاظ اس عظیم صوفی شاعر کے ہیں جسے دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ مولانا ۶۴۲ ہجری اور ۵/ جمادی الآخر ۶۷۲ھ (وفات) کے دوران جب ۳۷/ سال کے تھے تو انہوں نے عظیم صوفیانہ تالیف، یعنی مثنوی معنوی کو چھ دفتروں میں مدون کیا جو ۲۵/ ہزار اشعار پر مشتمل ہے، علاوہ ازیں ۲۵۰۰ غزلیں کہیں جن کے اشعار کی مجموعی تعداد بھی ۲۵/ ہزرا ہوتی ہے۔ پھر رباعیاں ہیں جن کی تعداد ۱۶۰۰ سے زیادہ ہے۔ کمیت کے اعتبار سے اشعار کی یہ

تعداد تعجب میں ڈال دیتی ہے۔ حیرت تو اس وقت ہوتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا ہر شعر گہرے عرفانی مفہوم کا حامل ہے۔ ان کے اشعار میں عموماً شاعرانہ افکار وتخیلات ایسے ہیں جو زیادہ تر متکبرانہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کم ہی کوئی شاعر ان کے مرتبے تک پہنچ سکا ہے۔ علاوہ ازیں ان کی زبان، عوام کی زبان ہونے کے ساتھ فارسی کی سنجیدہ شاعری کی زبان بھی ہے۔ جب ہم اس پہلو اور اس حقیقت پر غور کرتے ہیں تو ہمارا یہ خیال کہ ''وہ ایک عظیم ترین شاعر انسانیت ہیں''، غلط نہیں ہے اور یہ خود اس شخص کی وہ غیر معمولی کامیابی ہے جو شاعری کو معدے کی صفائی سے تشبیہ دیتا ہے۔

شمس کے غائب ہوجانے کے بعد جلال الدین نے کسی اور سے ارادت وعقیدت پیدا کرلی اور ان سے الہام حاصل کرنے لگے۔ مثلاً ''مثنوی'' کو صلاح الدین فریدون زرکوب کے نام سے لکھا اور صلاح الدین کی وفات کے بعد حسام الدین چلپی پر توجہ ہوگئی جو جلال الدین کے انتقال کے بعد سلسلۂ مولویہ کے پہلے خلیفہ بنے۔ رومی کی تعلیمات سلجوقی سلطنت کی حکمت علمی میں بہت مؤثر رہی۔ مثال کے طور پر علاء الدین اکثر ان سے مشورے کیا کرتا تھا اور اس کا وزیر، امیر پروانہ معین الدین ہمیشہ مولانا کی مجالس میں شریک رہتا تھا جس کا نام بارہا کتاب ''فیہ مافیہ'' میں آیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا کی ثالثی اور ان کی معنی شہرت ہی کے سبب جب مغل فوجیں قونیہ کے قریب پہنچیں تھیں تو اس شہر کو تباہی سے نجات ملی تھی۔

ضروری ہے کہ رومی کے مضامین و اسلوب کو سمجھنے کے لئے ان کے بعض نمونے پیش کئے جائیں کتاب 'فیہ مافیہ' سے شروع کرتے ہیں۔ جب پروانہ، شیخ کے سامنے اپنے آپ سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:

''میں رات دن دل و جان سے خدمت میں مصروف ہوں۔ مغلوں کے مختلف النوع مشاغل کے باعث آپ کی خدمت میں نہیں پہنچ سکتا''۔

مولوی جواب دیتے ہیں: ''یہ کام بھی کارحق ہے اس لئے کہ مسلمانوں کے لئے اس میں امن و امان ہے۔ خود کو تم نے مال وتن کے لئے فدا کردیا ہے تاکہ ان کے دلوں کو جیت سکو، اس طرح کچھ مسلمان، اطمینان وسکون سے عبادت میں مشغول رہ سکیں، لہٰذا یہ کام بھی کار خیر ہے''۔

رومی نے اسی کتاب میں مسئلہ خیر وشر کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے۔

''.....پس جملہ اضداد ہمارے سلسلے میں ضد ہیں۔ حکیم کے لئے سب ایک ہی کام کرتے ہیں اور

ضد نہیں ہیں۔ کائنات میں دکھاوا کون سی بدی ہے جس کے پیچھے نیکی نہیں ہے اور کون سی نیکی ہے جس کے پیچھے بدی نہیں ہے۔ مثلاً ایک نے قتل کا ارادہ کیا اور زنا کا مرتکب ہوا۔ وہ خون اس کی گردن پر نہیں رہا۔ اس لحاظ سے کہ زنا کا ارتکاب کیا ہے۔ برا ہے، اس اعتبار سے کہ (زنا) مانع قتل ہوا، نیک ہے پس بدی اور نیکی ایک دوسرے سے جدا نہ ہونے والی چیز ہے۔ اسی لئے ہماری بحث مجوسیوں سے ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا دو ہے۔ ایک خالق خیر اور دوسرا خالق شر۔ اب تم خیر بے شر کو بتاؤ تا کہ ہم تسلیم کرلیں کہ خدائے خیر اور خدائے شر (الگ الگ ہے) اور یہ محال ہے اس لئے کہ خیر شر سے جدا نہیں ہے جب خیر و شر دو (الگ الگ) نہیں ہیں اور ان میں جدائی نہیں ہے تو ''دو خالق (بھی) محال ہے''۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''..... کافر و مومن خدا کی تسبیح پڑھتے ہیں کیونکہ حق تعالیٰ نے کہا ہے کہ جو شخص راہ راست پر چلے، سچائی اختیار کرے اور انبیاء و اولیاء کی شریعت و طریقت کو اپنائے اسے خوشیاں، نورانیاں اور زندگیاں حاصل ہوں گی اور اگر برعکس کرے تو تاریکیوں، خوف اور بلاؤں کا سامنا ہوگا۔ دونوں جب ایسا کرتے ہیں..... پس دونوں ہی خدا کے تسبیح خواں ہیں۔ وہ اپنی زبان میں اور یہ اپنی زبان میں..... مثلاً ایک چور نے چوری کی اور اسے پھانسی پر لٹکا دیا گیا..... وہ بھی مسلمانوں کا وعظ ہے جو بھی چوری کرے گا اس کا انجام یہی ہوگا۔ کسی کو بادشاہ نے سچائی اور امانت داری کے لئے انعام سے نوازا۔ وہ بھی مسلمانوں کے لئے واعظ ہے لیکن چور اس زبان میں اور امانت دار اس زبان میں لیکن تم ان دونوں واعظوں میں فرق دیکھو''۔

رومی نے اس چیز کی تشریح و تفصیل میں جو ان کے درون میں موجود تھی، داستان سرائی کا سہارا لیا اور پیچیدہ مسائل کو ایسے انداز میں بیان کیا ہے جو ان سے پہلے بزرگ صوفیوں، مصنفین اور اکثر اسلامی مفسرین کے یہاں پایا جاتا تھا۔ وہ چاہے شاعری اور فصاحت کا میدان ہو یا اخلاقیات اور تاریخ کا۔ سوائے اس کے کہ رومی نے ہمیشہ طبعاً نادر روایتوں کا ذکر کیا ہے۔ یہاں ان کی کتاب ''فیہ ما فیہ'' سے ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

''..... ایک شخص قمر الدین کے زرد آلو کے درخت سے پھل توڑ کر گراتا اور کھاتا جا رہا تھا باغ کا مالک دیکھ رہا تھا۔ کہا: خدا سے نہیں ڈرتے؟ جواب دیا۔ کیوں ڈروں؟ درخت خدا کا اور میں بندۂ

خدا، بندۂ خدا، خدا کا مال کھا رہا ہے۔ بولا: میں تجھے جواب دیتا ہوں۔

رسی لایا اور اسے اسی درخت سے باندھ کر مارنے لگا۔ اس نے شور مچایا اور بولا کہ خدا سے نہیں ڈرتے؟ کہا: کیوں ڈروں؟ تو خدا کا بندہ ہے اور یہ ڈنڈا خدا کا ہے۔ خدا کے ڈنڈے سے بندۂ خدا کو مار رہا ہوں''۔

تمثیل میں رومی کے طرز کا مشاہدہ کرنے کے لئے ایک اور مثال اسی کتاب سے پیش کر رہا ہوں۔

''.....مثلاً تو نے ایک کتے کو زرّیں طوق پہنادیا۔ اسے اس طوق کی وجہ سے شکاری کتا نہیں کہیں گے۔ شکاری اس صفت کا نام ہے جو اس کے اندر پوشیدہ ہے۔ اب چاہے وہ طوق زرّیں پہنے یا پشمیں۔ عالم جبہ و دستار سے عالم نہیں ہوگا۔ یہ ایک ایسا ہنر ہے جو اس کی ذات میں موجود ہے اگر یہ ہنر قبا و عبا میں ہو تو بھی فرق نہیں پڑتا۔ آدمیت ہونی چاہئے۔ مقصد یہی ہے باقی طول کلام ہے چونکہ بہت بناتے سنوارتے ہیں اس لئے مقصد فراموش ہوجاتا ہے''۔

ایک بقال ایک عورت پر عاشق تھا۔ اس نے کنیز سے پیغامات بھیجے کہ میں یہ ہوں، وہ ہوں، تیرا عاشق ہوں، جل رہا ہوں، مجھے آرام و چین نہیں۔ مجھ پر ظلم ہورہا ہے، کل یوں تھا اور مجھ پر کل ایسا ہوا، بڑے طول طویل قصے بیان کئے کنیز اس خاتون کے پاس آئی اور بولی: بقال نے سلام کہا ہے اور کہتا ہے کہ آیا کہ تجھے یہ کروں اور وہ کروں۔ بولی: اتنی سرد مہری سے؟ کہا: اس نے تو بہت کچھ کہا تھا لیکن اس کا مقصد یہی تھا۔ اصل تو مقصد ہی ہے باقی دردسر ہے.....''

رومی نے اپنی تعبیرات میں جس صراحت سے کام لیا ہے وہ دوسرے صوفیوں کے یہاں نہیں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ''فیہ ما فیہ'' میں آیا ہے۔

''.....جب کسی نے سنا کہ فلاں شہر میں ایک سخی ہے جو بہت بخشش و احسان کرتا ہے کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے وہاں جایا جائے۔ پس جب حق کا انعام اس قدر مشہور ہے اور پوری دنیا اس کے لطف و مہربانی سے واقف ہے۔ کیوں اس کے در کی گدائی نہیں کرتے اور خلعت و انعام کی امید نہیں رکھتے؟ کاہلوں کی طرح بیٹھے ہو کہ اگر وہ چاہے گا تو مجھے دے گا اور مانگتے نہیں۔ کتے کو تو عقل نہیں ہوتی جب بھوک لگتی ہے تو وہ تمہارے پاس آکر دم ہلانے لگتا ہے یعنی مجھے کھانے کو (روٹی) دے کہ میرے پاس روٹی نہیں ہے اور تیرے پاس ہے۔ اتنی تمیز تو ہے۔ آخر تو کتے سے کم نہیں ہے کہ وہ اس پر راضی نہیں کہ خاکستر پر سوجائے اور کہتا ہے کہ اگر تو چاہے گا تو مجھے خود روٹی

دے گا۔ رال ٹپکاتا ہے، دم ہلاتا ہے۔ تو بھی دم ہلا اور خدا سے مانگ اور گدائی کر، کیونکہ ایسے عطا کرنے والے کی گدائی کرنا عظیم مطلوب ہے"

کتاب مثنوی، فارسی کی دیگر مثنویوں سے مختلف ہے اس لئے کہ رومی نے ابتدا ہی میں بغیر کسی طویل تمہید و مقدمہ کے اپنا موضوع شروع کردیا ہے لہٰذا ان کا طریقہ دوسرے شعراء سے مختلف ہے۔ رومی پہلے مثال پیش کرتے ہیں جو خود موضوع کی حامل ہے اور اصلی منظر کو پیش کرتی ہے۔ مثلاً مثنوی کے آغاز میں ایک گروہ کی منظر کشی کرتے ہیں جو نالۂ نے کو سن رہا ہے پھر صوفی کی آرزو اور شور و شوق کا بیان کرتے ہیں جو وصل جاناں کے حصول کی کوشش میں ہے۔

بشنو این نی چون شکایت می کند — از جدایی ها حکایت می کند
کز نیستان تا مرا ببریده اند — از نفیرم مرد و زن نالیده اند
سینه خواهم شرحه شرحه از فراق — تا بگویم شرح درد اشتیاق
هر کسی کو دور ماند از اصل خویش — باز جوید روزگار وصل خویش
من به هر جمعیتی نالان شدم — جفت خوش حالان و بدحالان شدم
هرکسی از ظن خود شد یار من — وز درون من نجست اسرار من
سر من از نالۂ من دور نیست — لیک چشم و گوش را آن نور نیست
تن ز جان و جان ز تن مستور نیست — لیک کس را دید جان دستور نیست
آتش است این بانگ نای و نیست باد — هر که این آتش ندارد نیست باد
آتش عشق است کاندر نی فتاد — جوشش عشق است کاندر می فتاد
نی حریف هر که از یاری برید — پرده هایش پرده های ما درید
همچو نی زهری و تریاقی که دید — همچو نی دمساز و مشتاقی که دید
نی حدیث راه پر خون می کند — قصه های عشق مجنون می کند
محرم این هوش جز بیهوش نیست — مر زبان را مشتری جز گوش نیست
در غم ما روزها بیگاه شد — روزها با سوزها همراه شد
روزها گر رفت، گو رو، باک نیست — تو همان ای آنکه چون تو پاک نیست

اور مادیات سے معنویات و قدسیات کی طرف نفس کا ارتقا وہ اصل ہے جس کا بیان افلاطون و فلوطین

نے بھی اس سے پہلے کیا ہے اور ابن سینا نے اپنے معروف رسالہ' عینیہ' میں اس کی بہت اچھی تصویر پیش کی ہے۔ رومی کو بھی اس موضوع سے دلچسپی ہے اور اگر یہ کہیں کہ وہی قصیدہ مثنوی کبیر کا محور ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ مولوی نے دفتر چہارم کے آخر میں اس مسئلہ کو بخوبی بیان کیا ہے:

آمدہ اول بہ اقلیم جماد — وز جمادی در نباتی او فتاد
سالہا اندر نباتی عمر کرد — وز جمادی یاد ناورد از نبرد
وز نباتی چون بہ حیوانی فتاد — نامدش حال نباتی ہیچ یاد
جز ہمین میلی کہ دارد سوی آن — خاصہ در وقت بہار و ضمیران
ہمچنین اقلیم تا اقلیم رفت — تا شد اکنون عاقل و دانا و زفت
عقلہای اولینش یاد نیست — ہم از این عقلش تحلو کردنی است
تا رہد زین عقل پر حرص و طلب — صد ہزاران عقل بیند بو العجب
گرچہ خفتہ گشت و شد ناسی ز پیش — کی گزارندش در آن نسیان خویش
باز از آن خوابش بہ بیداری کشند — کہ کند بر حالت خود ریشخند
کہ چہ غم بر آنکہ می خوردم بہ خواب — چون فراموشم شد احوال صواب
چون ندانستم کہ آن غم و اعتلال — فعل خواب است وفریب است وخیال
ہمچنان دنیا کہ حلم نائم است — خفتہ پندارد کہ این خود دائم است
تا برآید ناگہان صبح اجل — وا رہد از ظلمت ظن و دغل
خندہ اش گیرد از آن غمہای خویش — چون ببیند مستقر و جای خویش

رومی نے اس روش کے پرتو سے جو ''مستقر و مکان'' کے حصول میں معاون ہوئی تھی ان چند لوگوں کے ساتھ مل کر جو مغلوں کی قتل گاہوں سے جان سالم بچانے میں کامیاب ہوگئے تھے، چراغ ایمان وحق کو ایسے دور میں روشن رکھنے میں کامیابی حاصل کی جب رنج والم کے خوفناک طوفانوں سے اس کے بجھ جانے کا خوف دامنگیر تھا۔ خوف وتشکیک کے پردوں کے باوجود جس نے بشر کو گھیر رکھا ہے۔ چراغ ایمان وحق کی روشنی میں پھیل رہی ہے اور یہ روشنی ان دلوں سے پھوٹ رہی ہے جو اسے موجودہ نسل سے آنے والی نسلوں کے حوالے کرنے کے آرزومند ہیں۔

نوٹ: استاد محمد باقر معین الغربائی نے ا۔ج۔ آربری کے اس مقالہ کو انگریزی زبان سے فارسی میں منتقل کیا جس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر حسن عباس شعبۂ فارسی بنارس ہندو یونیورسٹی نے کیا ہے۔